بھولے ہوئے لوگ

اُن کا آگے کو اٹھتا ہوا قدم رک گیا، یوں لگا جیسے ذہن میں کوئی ایک پردہ گر گیا ہو اور چاروں طرف تاریکی چھا گئی ہو جیسے۔ چند لمحوں کے لئے وہ خالی ذہن ، ساکت ، ہر جذبے ہر احساس سے خالی کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ ان کا منہ تھوڑا سا کھل گیا تھا اور بھاری فریم اور موٹے شیشوں کی عینک کے پیچھے سرخ پپوٹوں والی آنکھیں جیسے کچھ بھی دیکھ نہیں رہی تھیں۔ دائیں ہاتھ میں تھامے ، بچے کے ہاتھ پر بھی ان کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور بچہ جو جلدی سے سڑک پار کرنے کی تیزی میں تھا ایک جھٹکا کھا کر رک گیا اور سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔اس جھٹکے سے وہ تھوڑا سا جاگے ضرور مگر ذہن میں چھائی تاریکی چھٹی نہیں نہ ہی انہوں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ چلتی ٹرک کےعین درمیان کھڑے انہوں نے بچے کی طرف دیکھتے ہوئے معمول سے بلند اور کچھ غیر فطری سے لہجے میں پوچھا

" حسنین یہ ہم کہاں آگئے ہیں ؟"

حسنین نے دادا کی صورت دیکھی اور کہا " دادا ہم سڑک کراس کر رہے ہیں نا۔ جلدی کریں ورنہ آپ گاڑی کے نیچے آ جائیں گے "

انہوں نے جھک کر حسنین کی طرف دیکھا۔ وہ اس کو پہچانتے ہیں ، ان کے جگر کا ٹکڑا ہے یہ بچہ، اس کی میٹھی پیاری آواز سے بھی آشنا ہیں مگر یہ بات کیوں سمجھ میں نہیں آ رہی کہ وہ اس کے ساتھ جا کہاں رہے تھے، وہ ان کے پاس آیا کیسے؟ وہ تو وہاں تھے، ابھی ابھی وہاں تھے ، اپنے گاؤں میں ، نہر کے ٹھنڈے گیلے کنارے کی کیچڑ میں پیر ڈبا ڈبا کر چل رہے تھے کہ ابا نے کندھے پکڑ کر، کھینچ کر کیچڑ سے نکالا تھا اور کس زور سے تھپڑ مارا تھا ۔ انہوں نے اپنا بایاں ہاتھ اپنے رخسار پر پھیرا جیسے منہ ابھی تک جل رہا ہو ۔

دادا جلدی کریں نا" حسنین نے ان کا ہاتھ کھینچا

" اچھا بھئی اچھا چلتے ہیں " انہوں نے کچھ ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ان کے یوں سڑک کے عین درمیان کھڑے ہو جانے سے ٹریفک کی روانی میں رخنہ پڑ گیا تھا۔ دو ایک گاڑیاں آہستہ چلتی اُن کے پاس سے نکلتی چلی گئی تھیں۔ کچھ بےصبروں نے رفتار تو کم نہیں کی مگر پاس سے گذرتے ہوئے زور زور سے ہارن بجاتے ہوئے گئے۔ ایک تانگے والے نے پاس سے گذرتے گذرتے آگے جانے کا ارادہ بدل دیا اور سڑک کے کنارے تانگہ کھڑا کرکے تانگے سے اترا اور وہیں کھڑا ہو کر تماشا دیکھنے لگا۔ دو چار راہگیر بھی کھڑے ہو گۓ

" کیا ہوا جی ؟" ایک سائیکل والا پاس پہنچ کر سائیکل سے اتر کر کھڑا ہو گیا۔

حسنین نے دادا کی طرف دیکھا شائد وہ سائیکل والے کو اس کی بات کا جواب دیں گے مگر وہ خود حسنین کی طرف دیکھ رہے تھے کہ شائد وہی کچھ بتائے گا۔ سائیکل والے نے جیسے معاملے کی تہہ تک پہنچتے ہوئے سر ہلایا اور سائیکل سڑک کے کنارے ، درخت کے سہارے کھڑی کر کے واپس آیا اور حسنین کے کندھے پر ہاتھ رکھا ے

" کی گل ہے پُتر؟ " حسنین نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا

" ہم گھر جا رہے ہیں " اس نے تانگے والے کی طرف دیکھے بغیر بے رخی سے کہا۔

دادا ہمیشہ ایک بات کہتے ہیں کہ بازار میں اگر کوئی خواہ مخواہ بات کرنے کی کوشش کرے یا اپنے پاس بلانے ، کچھ دینے کی کوشش کرے تو کبھی بھی رکنا نہیں۔ جہاں رک کر بات سنی وہ تھیلے میں ڈال کر لے جائے گا۔ اب تو دادا ساتھ ہیں جواب دینے میں کوئی ڈر نہیں

بھولے ہوئے لوگ ۔ ۲

آپ ہی سچ بتاؤ بزرگو " اب کے اس نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔ انھوں نے پریشان ہو کر اپنے موٹے شیشوں کی عینک سے اس کی طرف دیکھا۔ " کچھ بات نہیں بھئی " انہوں نے سر پر ہاتھ پھیرا

(یہ کیا ہو رہا ہے -- کچھ پتہ نہیں چلتا -- میں کہاں ہوں ، کیا کرنا چاہ رہا ہوں ، اور یہ دھند کیسی ہے؟؟)

" تو پھر چلو آگے بڑھو بزرگو ۔ سڑک روک کے کیوں کھڑے ہو " اس نے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

" حسنین تم بتاتے کیوں نہیں کہاں جانا ہے " اب کے انہوں نے کچھ غصے میں آتے ہوئے کہا

" مجھے کیا پتہ دادا آپ ہی تو مجھے لے کرآئے ہیں۔ میں تو آپکو لے کر نہیں آیا " حسنین بھی ناراض ہو گیا۔ اتنے لوگوں کے سامنے دادا نے ڈانٹ دیا۔ گھر جا کر اماں کو بتاؤں گا ۔ اس نے دل ہی دل میں کہا ۔ مزا آئے گا دادا کو جب وہ ان کو ڈانٹیں گی ۔ اسی وقت ایک آدمی نے ان کا دوسرا ہاتھ تھاما اور سڑک سے ہٹا کر کنارے کی کچی زمین پر لے آیا۔

اب تک اچھے خاصے لوگ جمع ہو چکے اور ان سب کے بیچ یہ دونوں دادا پوتا ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے کھڑے تھے۔

" کیا ہوا ہے ؟" ایک اور آدمی نے جو ابھی ابھی بھیڑ دیکھ کر رُکا تھا ، لوگوں کو ہٹاتے ہوئے آگے بڑھا۔

" ہوگا کیا بھائی جان ، راستہ بھولے ہوئے ہیں بیچارے " صورتِ حال کی ذمہ داری اس نے اپنے ہاتھ میں لے لی تھی

" کیوں منے میاں گھر کہاں ہے تمہارا ؟" نو وارد نے پوچھا

" او جی تسی رہنے دیو ، میں پوچھاں گا" سائیکل والے نے رکھائی سے کہا اور ایک ہاتھ سے نو وارد کو اک ذرا ایک طرف ہٹا دیا

" ہاں بھئی ہاں تو ہی پوچھ لے " نو وارد نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ آج کل تو بھئی ہر کسی اسی تسی کو لیڈری کا شوق ہو گیا ہے۔

آس پاس کھڑے لوگ اس کی بات پر ہنس دئے۔ دلچسپی اور بڑھ گئی تھی۔ سائیکل والے نے نو وارد کو غصے سے دیکھا مگر کچھ کہا نہیں۔ زندگی میں کہیں تو پھر ملیں گے بچو، فیر دیکھاں گا تینوں۔ اس نے دل ہی دل میں کہا اور مڑ کر دونوں کی طرف دیکھا۔

" ہاں تو بزرگو کدھر سے آئے ہو ؟"

" گھر سے اور کہاں سے ؟" حسنین نے غصے سے کہا۔

" بالو تتے کیوں ہوتے ہو۔ ایک تو راستہ معلوم نہیں اوپر سے خار کھاتے ہو۔ گھار جانا ہے کہ نہیں ! سائیکل والے نے مداریوں والے لہجے میں کہا۔

" ہاں بزرگو کچھ تو بولو کہاں سے آئے ہو کہاں جانا ہے؟"

" وسن پورے " لوگوں میں کسی نےآواز لگائی

" اوئے نہیں، وسن پورے کیوں۔ ہیرا منڈی بول ہیرا منڈی "۔ ایک اور آواز آئی۔ بہت سے لوگ قہقہہ لگا کر ہنس دئے۔

" اوئے شرم کر اوئے تیرے گھر وچ کوئی وڈا چھوٹا نہیں ؟" سائیکل والے نے کہا

(رنگ رنگ کے رنگ۔ رنگ ہی رنگ۔ کہاں ہے ، وہ کہاں ہے۔ اس سے پہلے مجھے جانا تھا)

انہوں نے اپنا سر جھٹکنے کی کوشش کی۔ ذہن میں چھائی تاریکی چھٹتی ہی نہیں تھی۔ انہوں نےپھر ایک بار سر جھٹکا۔

بھولے ہوئے لوگ ۔ ۳

" دادا جان آپ سنتے کیوں نہیں؟" حسنین نے چیخ کر کہا۔ دھوپ تیز ہوتی جارہی تھی، پیاس بھی لگ رہی تھی اور دادا نے بوتل لے کر دینے کا وعدہ کیا تھا وہ بھی یاد نہیں۔ کوئی بات سنتے ہی نہیں۔

" ہاں بیٹا ہاں ۔ ابھی چلتے ہیں۔ انہوں نے بےبسی سے کہا۔ عجب بےچارگی تھی۔ کچھ بھی سدھر نہیں رہا تھا۔

(یہ اظہر اور اطہر کدھر چلے گئے ۔ کیا اسی دن کے لئے بڑا کیا تھا ان کو ؟ اور آغا کو دیکھو کیچڑ سے نکال کر پھر کیچڑ میں ہی چھوڑ کر چلے گئے۔ اب کہاں جاؤں گا اس بچے کو لے کر۔ اور اُس کو کس نے کہا تھا جانے کو۔ پہلے تو مجھے جانا تھا۔یہ ریزہ ریزہ ہوتا وجود کیسے سمیٹوں۔ کون ہیں یہ سب۔کس لئے گھیرے میں لے رکھا ہے)

" او چاچا کچھ تو بول منہ سے ، تیرا کوئی بھائی بند ہے بھی کہ نہیں اس شہر میں؟" سائیکل والا بیزار ہوکربولا۔

" ہاں بھئی ہاں اظہر ہے نا۔ بیٹا ہے میرا۔ دفتر گیا ہے۔ آتا ہی ہو گا۔

" چلو بھئی شکر کرو ، بڈھا کچھ تو بولا۔" کسی نے کہا۔

" اچھا چاچا پھر یہ بیٹا کام کیا کرتا۔ دفتر کا نام پتہ جانتے ہو بزرگو؟"

" واپڈا میں کام کرتا ہے بھئی۔" انھوں نے کہا

" واپڈا میں تو ابو کام کرتے ہیں۔ اظہر چچا امریکہ میں ہیں" حسنین نے جھنجھلا کر کہا

" ارے لونڈے سے پوچھو لونڈے سے ۔ بڑے میاں سے پوچھنا بےکار ہے"۔ مجمع سے پھر ایک آواز آئی۔

(میں یہاں کیوں ہوں۔یہ لوگ کیا کہتے ہیں۔پتہ نہیں میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں۔روانی ہے بھی اور نہیں بھی۔ بجلی کی ایک رو ہے بھاگتی پھرتی میرے اندر۔باہر کا راستہ مانگتی ہے۔راستہ ملتا کیوں نہیں۔کس نے بھٹکا دیا مجھے۔یہ کیسا بوجھ ہے۔کیوں بھئی کیوں پیتے ہو مجھے۔ حسنین کی ماں پہلے ہی ناراض رہتی۔میں کون ہوں۔اکائی۔میری اکائی۔کیا ہے میری اکائی کیا ہے۔کیا میں آزاد ہوں۔ حسنین۔کون۔)

" اچھا بچے تم ہی بتاؤ تمہارے ابے کا نام کیا ہے " سائیکل والا حسنین کے سامنے کھڑا ہوگیا

" میرے ماموں کا نام اطہرحسین ہے ، اظہرحسین میرے چچا ہیں ، وہ امریکہ میں رہتے ہیں۔ وہ واپڈا میں نہیں ہیں ، واپڈا میں میرے ابو کام کرتے ہیں۔" حسنین نے تیز تیز لہجے میں کہا۔

" اور گھار کتھے ہے۔" سائیکل والے نے پوچھا

" گھر؟ گھر ہم خود جا سکتے ہیں۔ دادا کو پتہ ہے گھر کہاں ہے۔ دادا اور میں گھر جا سکتے ہیں۔" حسنین نے کہا۔

" تمہیں گھر کا رستہ آتا ہے ؟"

" دادا کو آتا ہے"

"ارے چھوٹے بابو تمہارے دادا تو راستہ بھولے ہوئے ہیں ، وہ کہاں لے کر جائیں گے۔ تم بولو راستہ پتہ ہے تو۔"

" دادا کو پتہ ہے" حسنین نے زور سے کہا اور ساتھ ہی رونا شروع کر دیا

" لو دسو ! " سائیکل والے نے مداریوں کی طرح ہاتھ پھیلا کر لوگوں کی طرف دیکھا۔

" ارے ، ارے حسنین ، بھئی روتے کیوں ہو ، ابھی ہم گھر ہی تو جا رہے ہیں ، بس تھوڑی دیر میں پہنچ جائیں گے۔

بھولے ہوئے لوگ۔۴

بس پہنچے کہ پہنچے ، حوصلہ رکھو '' مگر حوصلہ تو وہ حسنین سے زیادہ خود کو دے رہے تھے۔

(اور حسنین کی ماں کی زبان شعلے برساتی ہے۔ کیسے کرتی ہے۔ اچھا ہے میں اپنے کمرے میں لیٹ جاتا ہوں۔ دیوار پر کھینچتا ہوں پھر گنتا ہوں۔اظہر آتا کیوں نہیں۔کتنی لکیریں ہو گئی ہیں۔وہ بھی چھوڑ کر چلی گئی۔اب کیوں آئے گی وہ۔کچھ خیال نہیں میرا۔کہتی ہے انتظار کر رہی ہے میرا۔میں جانا چاہتا ہوں)

'' میں جانا چاہتا ہوں '' انہوں نے غیر فطری ، بلند آواز میں کہا۔

'' تو پھر جا بڈھے جاتا کیوں نہیں '' کسی نے زور سے کہا۔ لوگ یوں ہنسے جیسے بہت مذاحیہ کہی گئی ہو۔

'' ارے چچا میاں آپ یہاں کیا کر رہے ہیں '' ایک مانوس آواز اچانک ان کے کانوں میں آئی اور ان کو ان کے اندر کی دنیا سے جیسے ہاتھ پکڑ کر باہر لے آئی۔

'' انور ارے میاں انور '' اپنے سینے میں روک رکھی سانس آزاد کرتے ہی انہیں یوں لگا جیسے سارا وجود ہلکا پھلکا ہو گیا ہو۔ اتنی دیر سے وہ اپنے پیروں کو مضبوطی سے زمین میں پیوست کئے کھڑے تھے اور اب انور کو دیکھتے ہی انہوں نے اپنا آپ ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اپنے جسم کی کم ہوتی ہوئی قوت سے انہوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ حسنین کا ہاتھ بھی اپنی معدوم ہوتی طاقت کے مل پر پکڑ رکھا تھا اس پر بھی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اب ایک شسا سا صورت سامنے تھی ، خبر گیری کرنے کےلئے کوئی تھا۔ حسنین کو اب کوئی خطرہ نہیں تھا۔ حسنین کی ماں بھی اب کچھ نہیں کہے گی۔ اب شعلے کیا جلائیں گے؟ اس کو کیوں لے لیا؟ شکائیت کروں تو کس سے کروں؟ اب بھی ہوں کہ نہیں ہوں ، پتہ نہیں چلتا۔

'' ہاں ہاں چلتا ہوں'' انہوں نے یو ں کہا جیسے کسی کسی کو جواب میں کہا ہو۔ کچھ لوگ پھر ہنسنے لگے۔

'' سب ٹھیک ہے بھائی ، بہت شکریہ تمہارا ، ان کا خیال رکھنے کا '' انور نے سائیکل والے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے حسنین کا ہاتھ تھاما اور دوسرے ہاتھ سے ان کو سہارا دیا۔

'' انور چچا پیاس لگی ہے۔ دادا نے کہا تھا بوتل لے کر دیں گے۔ ان کو تو کچھ بھی یاد نہیں'' حسنین نےہچکیاں لیتے ہوئے کہا

'' اچھا بیٹا ابھی لے کر دیتا ہوں'' انور نے اسے پیار سے تھپتھپایا

'' او بابو یہ دونوں آخر ہیں کون؟ '' سائیکل والا اپنی بے دخلی پر خوش نہیں تھا '' اتنا ٹیم خراب کر دیا میرا '' اس نے اپنی ناخوشی کا اظہار کیا۔

'' تکلیف کی معافی چاہتا ہوں بھائی ۔ میرے دوست کے والد صاحب ہیں یہ اور ساتھ میں اس کا بیٹا ہے۔ بہت زحمت ہوئی تمہیں بھیا ، ایک بار پھر معافی چاہتا ہوں۔ میں پہنچا دوں گا ان کو ان کے گھر تک۔ شکریہ۔

پھر ان سے مخاطب ہوا '' چلئے چچا ''

'' گھار والوں کو سمجھانا جا کر بابو ، ان کی یہ حالت ہے تو نکلنے ہی کیوں دیتے ہیں اور وہ بھی اتنے چھوٹے بچے کے ساتھ۔ مانو بڈھے کی ضرورت نہیں پر یہ بچہ بھی نہیں چاہیئے کیا '' سائیکل والا ابھی پیچھا چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔

انور نے ان سنی کر دی۔ '' چلئے چچا تانگہ لئے لیتے ہیں ، میں آپ کو گھر پر چھوڑ دوں گا ''

'' ایک منٹ رکیں بابو صاحب ، میرا تانگہ سڑک کے اس طرف کھڑا ہے ، میں ابھی لے کر آیا'' تانگے والے نے آگے بڑھتے ہوئے کہا ۔

بھولے ہوئے لوگ ۔۵

کھیل ختم ہو گیا تھا ، لوگوں کی دلچسپی بھی ساتھ ہی ختم ہو گئی۔ لوگ رفتہ رفتہ اپنے رستوں پر جانے لگے۔ تانگے والا اپنا تانگہ لے آیا۔ انور نے پہلے ان کو سہارا دے کر بٹھایا پھر حسنین کو اگلی سیٹ پر سوار کیا اور خود پچھلی پیٹ پر ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ صرف سائیکل والا سڑک کنارے کھڑا رہ گیا۔ جب تانگے والے نے تانگہ آگے بڑھایا تو وہ بھی مڑ کر اپنی سائیکل کی طرف گیا اور اٹھتے قدم روک کر وہیں کھڑا رہ گیا۔ پھر زور سے چیخا

'' اوئے میری سائکل ۔ میری سائیکل کون لے گیا ۔ اوئے سور دے پتر و کون لے گیا میری سائیکل ۔ اوئے کوئی بھلے کا زمانہ نہیں ۔ میری سائیکل ، میری سائیکل ۔۔۔''

جاتے جاتے لوگ پھر ٹھہرنے لگے۔

تانگے والے نے مڑ کر دیکھا ، پھر زور سے ہنس دیا اور گھوڑے کو چابک مارتا آگے بڑھا لے گیا۔

گھر کے پاس پہنچ کر انور نے اُترنے کے بعد پہلے حسنین کو اتارنا چاہا مگر وہ اس سے پہلے ہی تانگے چھلانگ لگا کر اترا اور زور زور سے روتا ہوا گھر کے اندر چلا گیا۔

'' دادا گندے ہیں ، دادا بالکل بھی اچھے نہیں ، کہتے تھے رکشا میں لے کر جاؤں گا اور رکشا میں نہیں لے کر گئے بوتل بھی نہیں لے کر دی ، دادا گندے ہیں ، دادا ذرا بھی اچھے نہیں'' اس کی باریک ، غصیلی آواز کہیں اندر چلی گئی۔

انور جب انہیں تانگے سے اتار کر دروازے کے پاس آیا تو حسنین کی ماں گڈو کو کندھے سے لگائے اور ٹانگوں سے لپٹے حسنین کے سر پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔ منہ لال ہو رہا تھا اور آنکھوں میں نہ جانے کیا تھا کہ نظر ملانا آسان نہیں تھا۔ ان لوگوں کے قدموں کی آواز پہلی سیڑھی سے آگے نہ بڑھی تھی کہ اس نے اپنے اندر ابلتے غصے کو راستہ دینے کے لئے لب کھولے مگر انور پر نظر پڑتے ہی ایک دم لب بند کرلئے۔ پل بھر انور کی طرف دیکھتی رہی پھر کچھ بھی کہے بغیر بچوں کے ہاتھ اندر چلی گئی۔ موٹے شیشوں کی عینک سے انہیں کیا نظر آتا اور ویسے بھی جس ہزیمت سے وہ بازار سے گذرے تھے ، اچھا تھا کہ اس سے ان کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ اپنی شکست کی تصویر اب ایک بار پھر آمنہ کے چہرے پر کیا دیکھتے۔ ایک ساتھ دو دو شکستوں کا سامنا کرنے کی ان میں ہمت نہیں تھی۔

انور نے ان کو آگے بڑھایا اور ساتھ ہی حسنین کو آواز دی '' حسنین دیکھو ، اپنے دادا جان کو ان کے کمرے میں لے جاؤ '' پھر دیوار پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا '' بھابھی صاحبہ ذرا چچا کو دیکھ لیں ، شائد شائد چائے پانی کی ضرورت ہو۔ راستہ بھول گئے تھے ، پتہ نہیں کب سے دونوں دھوپ میں کھڑے تھے ۔ ''

کچھ دیر رک کر انور نے جواب کا انتظار کیا مگر جواب آیا نہ ہی کوئی انہیں لینے آیا۔ انہوں نے تھوڑا ہنستے ہوئے خود ہی کہا '' بھئی انور تمہارا بہت شکریہ ، اب تم جاؤ میں خود چلا جاؤں گا '' اور اس سے ہاتھ چھڑا کر دیوار کا سہارا لے کر برامدے کی آخری سیڑھی چڑھ گئے پھر پلٹ کر انور کی طرف دیکھا۔ ایک اداس مسکراہٹ ان کے چہرے پر پھیلی تھی اور عینک کے شیشے دھندلے تھے ، پتہ نہیں کس کی آنکھ کے آنسو دیکھنے نہیں دے رہے تھے۔ انور جلدی سے پلٹا اور سیڑھیاں اتر کر گیٹ سے باہر نکل گیا۔ اس ایک لمحے کی خاموشی اور تھکے ہوئے چہرے پر پھیلی لاچار مسکراہٹ نے اس سے سب کہ دیا تھا۔ گلی سے سڑک تک پہنچتے پہنچتے اس نے کیا کیا سوچ ڈالا ' اگر میرے

بھولے ہوئے لوگ۔٦

میرے ماں باپ زندہ ہوتے۔اگر میرے ہی گھر میں ہوتے۔اگر میری بیوی ایسی ہوتی۔اگر میں ایسا بے حس انسان ہوتا۔ کیا کرتا۔ کیا نہیں کرتا۔ اگر وہ زندہ ہوتے۔۔۔ '

گلی پار کرکے وہ جیسے ہی سڑک پر آیا گاڑیوں کا ایک سیلاب اس کے سامنے سے گذر گیا۔ اس کے تیز تیز اٹھتے قدم ایک دم رک گئے اور اس سیلاب میں اپنا راستہ بنا کر پار اترنے میں وہ لمحہ بھر پہلے کی کیفیت، وہ رنج، وہ افسوس سب اس کے ذہن سے نکل گیا۔ سڑک کے اس پار پہنچ کر اس نے ایک بڈھے فقیر کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر ایک چونّی رکھی اور ہلکا پھلکا ہو کر آگے بڑھ گیا۔

اتنی ہی دیر میں وہ بھی اپنے کمرے میں پہنچ کر بستر پر لیٹ چکے تھے۔ کچھ دیر یونہی سیدھے لیٹے رہے پھر دیوار کی طرف منہ کر کے دیوار پر کھنچی لکیریں گننے لگے۔